گلیلی کا پرندہ ــــ محمود درویش

آصف علی چٹھہ☆

Abstract

Mahmoud Darwish was the most popular and the finest modern resistance poet of Palestine. He was regarded as the national poet of Palestine, a true voice of voiceless Palestinians to the world and a most precious cultural icon. Darwish's poetry is replete with the tragic saga of Palestine in form of exiles, murders, sieges, and racism, resistance and perseverance. Besides his brief introduction, the article highlights his love for homeland, his political activism and his contribution as a resistance poet.

جب فرانس کے صدر چارلس ڈیگال کو یہ مشورہ دیا گیا کہ الجزائر کی آزادی کی حمایت کرنے کے جرم میں ژاں پال سارتر ے کو گرفتار کیا جائے تو اس نے کہا تھا کہ سارتر ے کو کیسے گرفتار کیا جا سکتا ہے سارتر ے تو فرانس ہے۔(۱)

محمود درویش 13مارچ 1941 کو فلسطین کے شہر گلیلی (Galilee) کے ایک گاؤں بروے(Birwe) میں پیدا ہوئے۔ 1948 کی جنگ میں انھیں بیروت ہجرت کرنا پڑی اور اسرائیل نے ان کا گاؤں صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ ایک برس سے زیادہ عرصے کے بعد جب ان کا خاندان وطن واپس پہنچا تو مردم شماری کا کام ختم ہو چکا تھا۔لہٰذا انھیں شناختی دستاویزات سے محروم کر دیا گیا۔(۲)

اسرائیلی حکومت نے محمود درویش کو متعدد بار پسِ زنداں دھکیل کر اس کی آواز کو دبانے

☆ لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز ، لاہور

کی کوشش کی لیکن بے سود۔ فلسطینی مزاحمت کے اس معروف ترجمان اور ثورہ ادب کے اس معتبر نمائندے کی آواز تمام جغرافیائی حد بندیاں عبور کر چکی ہے۔ اس کی شاعری کے تراجم فرانسیسی، انگریزی، روسی، اطالوی، بلغارین، اردو اور دنیا کی متعدد دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ فلسطین کے قومی ترانے، تیس کے قریب شعری مجموعوں اور آٹھ نثری تصانیف کے خالق کا نام آج فلسطین کا مترادف قرار پا چکا ہے۔

محمود درویش نے گلیلی کے ایک قصبے دیر الاسد میں ثانوی درجے تک تعلیم حاصل کی۔ کفر قاسم میں عبرانی اور عربی درسیات کی تکمیل کی۔ الاتحاد، الجدید، اور الاہرام جیسے اخبارات سے وابستہ رہے۔ پہلا مجموعہ کلام ''پروں کے بغیر پرندے''، 18 سال کی عمر میں 1960 میں چھپا۔ 1969 میں لیفر والیشین رائٹرز کی جانب سے 'لوٹس' پرائز ملا۔ جو انھوں نے نئی دہلی میں افریقی ایشیائی ادباء کی کانفرنس (نومبر 1970) کے موقع پر آنجہانی اندرا گاندھی کے ہاتھوں وصول کیا۔ 1971 میں قاہرہ چلے گئے۔ 1973 میں بیروت میں منتقل ہو کر پی۔ ایل۔ او کے باقاعدہ ممبر بن کر اس کے علمی رسالے کے ادارت سنبھالی۔ 1980 میں میڈی ٹرینین اور 1982 میں لینن انعام سے نوازا گیا۔ 1987 میں وہ پی۔ ایل۔ او کی مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے اور 1993 میں جب اسرائیل سے اوسلو امن معاہدہ ہوا تو وہ مجلس انتظامیہ سے مستعفی ہو گئے۔ 1995 سے وہ فلسطینی علاقے رام اللہ میں رہائش پذیر تھے۔ محمود درویش 9 اگست 2008 کو عارضہ قلب کے باعث 67 سال کی عمر میں وطن سے دور امریکی ریاست ٹیکساس میں رحلت کر گئے۔ فلسطینی صدر محمود عباس نے ان کے جنازے کو کندھا دیا۔ 13 اگست 2008 کو انھیں پورے قومی اعزاز کے ساتھ رام اللہ میں سپرد خاک کیا گیا۔(۳)

محمود درویش کی وفات پر دنیا بھر کے مشاہیر اور علمی و ادبی شخصیات نے محمود کی علمی و ادبی خدمات اور فلسطین کیلئے ان کے بے پناہ محبت کو زبردست الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس ضمن میں سیف دین عماوس رقمطراز ہیں:

"If ever anyone in history deserved the title of Poet Laureate, it was

indeed Darwish, who spoke the mind of his people in a way I doubt anyone has ever been able to do for any other people."(۴)

سنان انطون لکھتے ہیں:

"Very few poets become the voice of their nation and even fewer succeed in transcending that to become much more. Mahmoud Darwish was that rare bird who crossed many skies and horizons. With his departure, Palestine loses one of its most precious cultural icons, a poetic voice of universal echoes.".(۵)

محمود درویش کی شاعری کا سب سے توانا اور مضبوط حوالہ فلسطین ہے۔ فلسطین کی محبت اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ فلسطین اس کی آرزوں اور امنگوں کا مرکز ہے۔ اس کے خوابوں اور خیالوں کا تانا بانا فلسطین ہے۔ اسکو پابندِ سلاسل کر کے اس کے دل سے فلسطین کی محبت کو کم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی کلائی پر ہتھکڑی بھی اس کے وطن کا نقشہ ابھار دیتی ہے۔ وہ فلسطین کے ذرے ذرے کی پرستش کرتا ہے۔ اس کی خوشی اس کا غم اس کی زندگی اور موت فلسطین ہے۔ شاید اسی مناسبت سے درویش کو فلسطینیوں کی سانس کہا جاتا ہے۔

تم ہی میرے لیے غم اور خوشی ہو/میرے زخم اور قوس قزح ہو/مری قید اور آزادی ہو/تم میری مٹی اور داستان ہو/تمام زخموں سمیت تم میری ہو/ہر زخم ایک باغ ہے/تم ڈوبتے ہوئے سورج کی مانند ہو/تم روشن رات ہو/تم میری موت اور حیات ہو۔(۶)

محمود درویش جب 1995 میں ایک طویل عرصہ مہاجرت کے بعد اپنی محبوب سر زمین کی طرف واپس لوٹا تو اس نے فلسطین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

"As long as my soul is alive none can smother my feeling of nostalgia to a country which I still consider as a Palestine".(۷)

فلسطینی دانشور ایڈورڈ سعید جب کئی سال بعد یروشلم واپس آیا تو اسرائیلی حکام نے پوچھا کہ تم نے اسرائیل کب چھوڑا تھا۔ اس نے لفظ فلسطین پر زور دیتے ہوئے کہا کہ میں دسمبر 1947 میں فلسطین

سے گیا تھا۔محمود درویش کی بھی سب سے بڑی پہچان اور شناخت فلسطین ہے۔عرب قومیت اس کیلئے باعثِ فخر اورموجب توقیر ہے اور وہ اپنے اس تشخص کو کسی بھی قیمت پر فراموش نہیں کرنا چاہتا۔ درویش کی مزاحمتی شاعری میں 'شناختی کارڈ'، ایک نہایت عمدہ نظم ہے۔ یہ نظم 1960 کے عشرے کے آخر میں منظر عام پر آئی۔ اس میں فلسطین کے باسیوں کے اپنی سرزمین سے ایک لازوال ازلی و ابدی رشتے کا فنکارانہ اظہار ہے۔نظم میں درویش اپنی پوری قومی حمیت، مجاہدانہ طنطنے اور فلسطینی شناخت کے ساتھ ایک اسرائیلی سپاہی محرر سے مخاطب ہے۔ اس نظم میں درویش نے فلسطینیوں کو محض ایک نام کے بجائے ایک زندہ حقیقت اور ایک گوشت پوست کے انسان کے طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ درویش نے صحیح معنوں میں فلسطینیوں کو تاریخ کے صفحات سے مٹا دینے کی ناپاک اسرائیلی سازش کو ناکام بنادیا ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے کہ اگر کسی بھی فلسطینی کی کسی بھی تحریر کو قومی نظم کہا جا سکتا ہے تو وہ محمود درویش کی مختصر نظم "بطاقۃ الھویہ" (شناختی کارڈ) ہے۔ درویش کی اس نظم میں تشنیع زبردست اہمیت رکھتی ہے۔(۸) فلسطین اور فلسطینیوں کی کتھا سمجھنے کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے:

ہاں رجسٹر میں لکھو/ میں ہوں عرب/ کارڈ کا نمبر ہے اکاون ہزار/میرے بچے آٹھ ہیں اورنواں آنے کو ہے گرما کے بعد/ اس میں کیا ہے ایسی جھنجھلاہٹ کی بات

ہاں رجسٹر میں لکھو/ میں ہوں عرب/ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح میں/ پتھروں کی کان میں مزدور ہوں/ آٹھ جو بچے ہیں میرے/ ان کی روٹی ان کے کپڑے اور ان کی کاپیاں/قوت بازو سے اپنی/ پتھروں سے چھین کر لیتا ہوں/ بھیک لینے آپ کے در پر کبھی آیا نہیں ...../آپ کی دہلیز پر جھکنا میرا شیوہ نہیں/ اس میں کیا ہے ایسی جھنجھلاہٹ کی بات

ہاں رجسٹر میں لکھو/ میں ہوں عرب/ میں تو بس اک نام ہوں میرا لقب کوئی نہیں/ ایک ایسے ملک میں بھی/ جس میں ہر شے/ برہمی کے اک بھنور میں مستقل گردش میں ہے/ صبر سے جیتا

ہوں میں/ آفرنیش مری کچھ اس سے پہلے ہی کی ہے/ وقت جب پیدا ہوا/ جب صدیاں تھیں شگوفے بن کھلے/سرو تھے جب اور نہ یہ زیتون تھے/ جب خس وخاشاک یوں پھیلے نہ تھے

باپ میرا ہل چلانے والوں میں سے ایک ہے/ اشرف وامجد نہیں/ اور دادا جان بھی تھے اک کسان/کوئی شجرہ اور نہ عالی خاندان/گھر میرا اک پھونس کی کٹیا ہے چوکیدار کی/ کہیے کیا اب مطمئن ہیں حیثیت سے میری آپ؟/ میں تو بس اک نام ہوں بے خاندان۔

ہاں رجسٹر میں لکھو/ میں ہوں عرب/ رنگ بالوں کا' سیاہ/ آنکھیں بھوری/ کیا میری پہچان ہے؟ کیا ہے شناخت/سر پر اک رومال اور اس پر عقال/ جو چھوئے گا اس کو چھل جائیں گے ہاتھ/ اور پتا میرا؟ میں رہنے والا ہوں اس گاؤں کا/ دور افتادہ کچھ اتنا یاد بھی آتا نہیں/ اس کی گلیاں سب کی سب بے نام ہیں/ اور جتنے مرد ہیں/کھیتوں میں یا کہیں کانوں میں ہیں/ اس میں کیا ہے ایسی جھنجھلاہٹ کی بات۔(۹)

تحریک آزادی فلسطین کے سفر میں محمود درویش کی شاعری نے نہ صرف اپنے لوگوں کی رہنمائی اور ہمت افزائی کا فریضہ سر انجام دیا ہے بلکہ دشمن کی سفاکی، چالاکی اور بربریت کی طرف بھی اقوام عالم کومتوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ درویش کی آوازفلسطین کے مقہور،مجبور اور بے بس لوگوں کی صدائے احتجاج بن کر دنیا بھر کے ایوانوں میں گونجتی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی درویش کی شاعری کو اسرائیلی حکومت کیلئے خطرہ تصور کیا جاتا ہے۔حتیٰ کہ جب درویش ابھی آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس نے اسرائیلی ریاست کی آٹھویں سالگرہ کےموقعہ پر اپنے ہیڈ ماسٹر کےحکم پر زندگی میں پہلی نظم سنائی تواس میں اسرائیلی حکومت کے خلاف ایک معصوم احتجاج سے اسرائیلی اس قدر برہم ہوئے کہ دوسرے دن مجد الکروم کےفوجی دفتر سے بلاوا آگیا۔ درویش کے الفاظ ہیں۔''میں گیا اوران سے بہت گالیاں اور دھمکیاں سنیں۔میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔ دفتر سے باہر آکر میں پھوٹ پھوٹ کر رویا اس لیے کہ ان کی دھمکیوں کا آخری جملہ یہ تھا اگر تم نے آئندہ کبھی ایسے شعر کہےتو تمہارے باپ کوپتھروں کی کان کے کام سے

الگ کر دیا جائے گا۔''(۱۰) لیکن وقت نے ثابت کیا کہ درویش ہر حال میں پرورش لوح وقلم کرتا رہا۔ اسے حق گوئی و بے باکی کی پاداش میں متعدد بار جیل بھی جانا پڑا لیکن یہ ذوق گنہ ہر سزا کے بعد بڑھتا ہی رہا۔

درویش کی نظم ''انقلابی اور شاعر'' بھی جبر اور ظلم کے خلاف استقامت اور پامردی کی ایسی ہی کیفیت کی غمازی کرتی ہے:

بے شک میرے ہاتھ پیچھے باندھ دو/ مجھ سے کتابیں اور سگریٹ چھین لو/ میرے منہ میں مٹی بھی بھر سکتے ہو/ مگر شعر میرے دل کا دھڑکتا ہوا خون ہے/ میری روٹی کا نمک ہے/ میری آنکھ کا پانی ہے/ یہ ناخنوں، پلکوں اور خنجروں سے لکھا جائے گا/ میں جیل کی کوٹھڑی میں بھی گاتا رہوں گا /غسل خانے میں/ اور اصطبل میں بھی گنگناتا رہوں گا /کوڑوں کے نیچے بھی شعر ہوتے رہیں گے /ہتھکڑی کے درمیان میں/ زنجیروں کی جھنکار گاتی رہے گی /میرے اندر لاکھوں بلبلیں ہیں/ جو مجھے ترانے سناتی رہتی ہیں۔(۱۱)

Siafdean Ammous نے درویش کے شاعرانہ اعجاز اور تاثیر کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

"His peerless poetry and striking emotion were enormously successful in drawing world attention to the plight of Palestine, galvanizing Palestinians to their cause, and rallying millions of Arabs around the cause. All the countless millions spent on public relations campaign by the Israeli Foreign Ministry were never a match to any of Darwish's powerful poems".(۱۲)

محمود درویش اپنے بچپن کی دہلیز پر تھا جب اُس کے کان وطن، جنگ، سرحد، مہاجرین، فوج اور خبر نامے جیسے الفاظ سے آشنا ہوئے۔ اُس کے الفاظ میں بچپن کے حالات و واقعات نے مجھ سے میرا عہد طفلی چھین لیا۔ درویش کے خاندان کے افراد نے کس طرح اپنے گھر بار افراتفری کے عالم میں چھوڑ جنگل میں چھپ کر اپنی جانیں بچائیں اور لبنان میں پناہ گزین ہوئے، بے بسی

اور بے بس کی اس داستان کا ذکر درویش نے اپنے ایک انٹرویو میں کیا ہے:

''میں سات ہی برس کا تھا کہ میرے بچپن کا کھلنڈراپن یک لخت ختم ہو گیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ کیسے ہوا۔ گرما کی ایک رات تھی گاؤں کے لوگ حسبِ عادت چھتوں پر سو رہے تھے۔ آدھی رات کو میری ماں نے اچانک مجھے نیند سے بیدار کیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو گاؤں کے سیکڑوں لوگوں کے ساتھ جنگل میں چھپتے اور بھاگتے پایا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ایک رات کے مسلسل سفر کے نتیجے میں میرے بہت سے عزیز و اقارب ادھر ادھر بکھر گئے۔ اور میں ان میں سے ایک عزیز کے ساتھ ایک اجنبی گاؤں میں آ گیا۔ جہاں کے بچے بالکل دوسری طرح کے تھے۔ میں نے سادگی سے کسی سے پوچھا ''میں کہاں آ گیا ہوں'' اور میرے کان میں پہلی دفعہ لبنان کا لفظ پڑا''۔(۱۳)

ایک برس بعد جب درویش اپنے خاندان کے ساتھ واپس فلسطین آیا تو اُس کا گاؤں کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ وہ گاؤں تھا نہ گلیاں نہ گھر۔ مجبوراً گلیلی کے ایک قصبے دیر الاسد میں رہائش اختیار کی اور اپنے ہی وطن میں بے وطن اور مہاجر بن کر رہنا شروع کر دیا۔ چونکہ مردم شماری ختم ہو چکی تھی لہٰذا شناختی دستاویزات کا حصول ناممکن تھا۔ درویش اپنے اس دورِ نکبت کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جب میں دیر الاسد میں آیا تو دوسری جماعت میں تھا۔ مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ایک نیک خصلت انسان تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب کوئی انسپکٹر تعلیم ہمارے مدرسے کے معائنے پر آتا تو ہیڈ ماسٹر مجھے اپنے پاس بلاتے اور کسی چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیتے۔ اس لیے کہ حکومت کے لوگ مجھے خفیہ درآمدگان میں شمار کرتے تھے۔ جب بھی پولیس اس گاؤں کا چکر لگاتی، مجھے کسی الماری یا کسی کونے کھدرے میں چھپا دیا جاتا۔ اس لیے کہ میرا وہاں اپنے وطن میں کھلے بندوں رہنا ممنوع تھا۔ مجھے میرے بڑوں نے سمجھا رکھا تھا کہ میں یہ اعتراف کبھی نہ کروں کہ میں لبنان میں تھا۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہوں کہ میں شمال کی طرف کسی بدوی قبیلے میں چلا گیا تھا۔

میں نے ایسا ہی کیا تا کہ میں اپنا اسرائیلی شناختی کارڈ حاصل کر سکوں۔ رہی قومیت تو وہ اپنے وطن میں آج تک حاصل نہ کر سکا''۔(۱۴)

اگر محمود درویش کو کم سنی میں دربدری اور غریب الوطنی کے تلخ اور نا گوار تجربے سے دوچار ہونا پڑا تو بے گھر ہونے کی اداسی اور ہجرت کے شدید احساسِ محرومی نے بھی عمر بھر اس کے اندر گھر کیے رکھا۔ اپنا گھر اور اپنی سرزمین محض رہنے کیلئے ایک جگہ نہیں ہوتی بلکہ آرزوؤں، جذبوں اور رشتوں کا ایک رنگا رنگ گلشن ہوتا ہے اور اس گلشن کے اجڑنے سے خوابوں کا سارا تاج محل چکنا چور ہو جاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے فلسطینیوں کی اس کسمپرسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔''جن لوگوں سے ان کی زمین کا فرش اور سر پر حکومت کا سایہ چھن جائے۔دنیا کا کوئی خطہ انہیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو اور کہیں چلے جانے کا راستہ بھی نہ رہے اور ان کا ماضی محض ایک تلخ یاد کے طور پر زندہ ہو، ان کے احساسات کو کوئی بھی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا''۔(۱۵)

میرا ملک ایک سفری تھیلا ہے/یا یوں کہو کہ ایک سفری تھیلا، میرا ملک ہے/یہاں کوئی پلیٹ فارم نہیں/کوئی دیوار نہیں/میرے پاؤں کے نیچے کوئی زمین نہیں/کہ میں اس طرح مر سکوں جیسے میں چاہوں/میرے اردگرد کوئی آسمان نہیں ہے/کہ میں پیمبری کی خیمہ بستی میں پناہ لے سکوں /میری کمر دیوار کے ساتھ لگی ہے/دیوار بھی کیسی ۔۔۔ایک گری ہوئی دیوار/میرا ملک ایک سفری تھیلا ہے/میرا سنہری تھیلا خانہ بدوشوں کا ملک ہے/یہ لوگ گیتوں اور دھویں کے خیمے میں رہتے ہیں/یہ لوگ اپنے لیے وطن کی تلاش میں/نوکیلے پتھروں اور بارشوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔(۱۶)

سنان انطون نے ایک جگہ درویش کی شاعری میں اسی کرب مہاجرت کے شدید احساس کا ذکر کیا ہے:

"The harrowing experience of losing his home and being an internal exile in his land at such a young age would haunt Darwish's poetry and become a central theme with rich and complex variations running throughout his oeuvere".(۱۷)

ان کی ایک اورمعروف نظم ماں کے نام (جلا وطن کا خط) بھی اسی طرزِ احساس کی نمائندہ ہے اور اس کو بے چشم نم پڑھنا مشکل ہے۔

میں اب بیس سے اوپر ہوگیا ہوں/ماں ! مجھے کبھی دیکھو/ میں مردوں کی طرح زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں/ ایک ریستوران میں کام کرتا ہوں۔ برتن دھوتا ہوں۔/گاہکوں کیلئے کافی بناتا ہوں۔/ اداس چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اوڑھے رکھتا ہوں/کہ وہ آرام اور سکون محسوس کریں /جانتی ہو ماں! میری آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں/فرض کرو میں کسی شام بیمار پڑ جاؤں/کیا رات مجھ پر ترس کھائے گی/ ایک مہاجر پر جو یہاں آیا / اور پھر واپس اپنے گھر نہ جا سکا/کیا اس درخت کو جس کے نیچے میں گروں گا / یہ معلوم ہوگا کہ یہ مردہ چیز کبھی انسان تھی /کیا وہ میری لاش کو گِدھوں سے بچالے گا / پیاری ماں !/نہیں جانتا کہ یہ کاغذ کالے کیوں کر رہا ہوں/کون سی ڈاک ہے جو انہیں لے جائے گی/بری ، بحری اور ہوائی راستے بند ہیں/ اور ہوسکتا ہے کہ تم سب مر چکے ہو/یا پھر زندہ ہو بغیر کسی پتے کے/کیا کوئی زندہ رہ سکتا ہے/بغیر ملک کے/بغیر گھر کے/بغیر جھنڈے کے/بغیر پتے کے(۱۸)

عربی زبان کی شعری روایت میں ابو الشعراء کے مقام ومرتبے کے حامل دورِ جاہلیت کے ممتاز اور منفرد شاعر امرؤ القیس کے اشعار پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی شاعری میں اجڑے دیار پر کھڑے ہوکر آنسو بہانے کی روایت بہت پرانی ہے۔محمود درویش کی شاعری میں بھی فلسطینی شہر آشوب غم واندوہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ فلسطین کی تباہی وبربادی پر نوحہ کناں ہے مگر اس کے ساتھ اس کے آنسوؤں میں امید کی چمک اور ولولے کی دمک بھی ہے۔ وہ ہواؤں کی طرح واپس گھر آنے کا عزم بھی رکھتا ہے۔ وطن اس کیلئے محض داستانوں کا مجموعہ یا یادوں کا گلدستہ نہیں ہے۔ وطن اس کیلئے ہڈیوں کی جلد اور سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ بے سروسامان ہے لیکن غاصبوں کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہے۔

ہاں رجسٹر میں لکھو/ میں ہوں عرب/تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے/باغ تھے جتنے میرے

اجداد کے/ اور چھینا ہے زمیں کا وہ قطعہ/ جس کو میں اور میرے بچے کاشت کرتے تھے کبھی/ تم نے میرے واسطے اور میری نسلوں کیلئے/ کچھ نہیں چھوڑا بجز پتھر یہاں/ کیا تمہاری یہ حکومت/ سارے پتھر بھی کہیں لے جائے گی/ لوگ کہتے تو یہی ہیں آج کل/ ہاں تو پہلے ہی صفحے پر سب سے اوپر یہ لکھو/ مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں/ لیکن اتنا ہے کہ میرا رزق اگر چھن جائے گا / غاصبوں کا گوشت بھی کچا چباجاؤں گا میں/ بس ڈروتم بھوک سے میری ڈرو/ اور میرے غیظ وغضب سے ڈرو۔(۱۹)

تحریک آزادی فلسطین کی داستان درویش کی شاعری میں رنگین تر ہو گئی ہے اس کی انگلیاں فگار اور خامہ خونچکاں ہے لیکن وہ وقت کے ہر جبر اور ظلم کے ہر ہتھکنڈے کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہے۔ زمانے کا کوئی فرعون اسے عزیمت کے راستے سے روک نہیں سکا۔ اس کا جواں عزم اور بلند حوصلہ تحریکِ آزادی کیلئے عظیم سرمایہ ہے۔ اس کی نظم ''آدمی کے لئے''ظلم کے خلاف ایک للکار ہے۔

سنو، او! خونی آنکھوں اور لہو میں ڈوبے ہاتھوں والو!/ رات زیادہ دیر نہیں رہتی/ بندی خانے ہمیشہ قائم نہیں رہتے/ نہ زنجیروں کی کڑیاں ہمیشہ جڑی رہتی ہیں/ نیرو مر جاتا ہے روم نہیں مرتا/ اپنی انہی آنکھوں کے ساتھ وہ لڑتا ہے/ اور انہی خشک کانوں کی بوائی/ وادی کو گندم سے بھر دے گی۔(۴۰)

درویش کی شاعری آزادی کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا عزم عطا کرتی ہے۔سختیاں اور تکالیف اس کی استقامت کو مزید جلا بخشتی ہیں اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں مجاہدوں کے زیور کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔محمود درویش فیض کے قبیلے کا شاعر ہے لہٰذا روزن زنداں کا بجھنا اس کے دل کو منور کر دیتا ہے اور سلاسل کی چھنک اسے آزادی کے نغمے سناتی ہے:

انھوں نے مجھے اس اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا/ اور میرا دل دھوپ کی کرنوں سے

جگمگا اٹھا / انھوں نے میرا نمبر دیوار پر لکھا / اور دیواریں سبزہ زاروں میں تبدیل ہوگئیں / انھوں نے میرے جلاد کا چہرہ بنایا / اور چمکدار پرندوں نے / یہ چہرہ پلک جھپکنے میں بکھیر کر رکھ دیا / میں نے اپنے دانتوں سے دیواروں پر / تمہارا نقشہ بنایا / اور تیزی سے گزرتی ہوئی رات کے گیت لکھے / میں نے اندھیروں کو شکست دی / اور اپنے ہاتھ روشنی کی لہروں میں ڈبو دیے / انہوں نے کچھ بھی فتح نہیں کیا / کچھ بھی فتح نہیں کیا / انہوں نے محض آتش فشانوں کے لاوے کو دہکایا ہے۔(۲۱)

فلسطین کے مکینوں کے دکھوں اور غموں کو محسوس کرنے سے اظہار کے سانچے واقعی آتش فشانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جب لوگ مر رہے ہوں اور گھر جل رہے ہوں تو دل کب سلامت رہتے ہیں۔ انجم رومانی نے 1947 کے فسادات کے پس منظر میں کہا تھا:

میرے اکھڑ پن پر مجھ کو معاف کریں احباب　　وہ لمحے، وہ منظر دیکھے، بھول گئے آداب

درویش نے اپنی آنکھوں سے نہتے فلسطینیوں کو دستِ ستم کے وار سہتے دیکھا ہے۔ اس نے خود آگ اور خون کے دریا عبور کیے ہیں لہٰذا اس سے مدھر سروں کی توقع عبث ہے:

سوسن کے سفید پھولوں کا گلدستہ جو میرا دل تھا / لو کے زہر سے جل کر سیاہ ہوگیا ہے / آگ نے اپنی زبان میرے ہونٹوں میں رکھ دی ہے / میں نے اداسیوں سے وفا داری کا حلف اٹھا رکھا ہے / جلا وطنی اور بھوک سے ہاتھ ملا چکا ہوں / غصہ میرا ہاتھ ہے / غصہ میرا منہ ہے / میری رگوں کے لہو میں غصے کا عرق دوڑ رہا ہے / مجھ سے مدہم سروں کے گیت کی توقع نہ رکھو / جنگل آبادیوں کو نگل جائیں / تو پھول کانٹے بن جاتے ہیں۔(۲۲)

محمود درویش کی ہر نظم خون میں لتھڑے ہوئے فلسطین کی ایک خونچکاں داستان ہے۔ اور اس داستان کے کردار فلسطین میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ 1948 کی سفاکانہ قتل و غارت کے بعد اسرائیل نے فلسطین کے 77% حصے پر قبضہ کر لیا اور 1967 کی جنگ میں باقی 23% بھی اسرائیل کے زیر نگین آ گیا۔ طویل مذاکرات کے بعد یاسر عرفات کی فلسطینی قومی اتھارٹی کو جو علاقہ ازراہِ خیرات دیا گیا وہ بھی قدیم فلسطین کا تقریباً 4% بنتا ہے۔ فلسطینیوں نے لبنان میں

پناہ لی تو وہاں بھی حملہ کر دیا گیا۔ یوں اسرائیل نے ہر لحاظ سے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ 1983 سے جب تنظیم آزادی فلسطین PLO کے مجاہد لبنان چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے تو درویش نے اپنی نظم ''زمین ہم پر تنگ ہو رہی ہے'' لکھ کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا:

زمین ہم پر تنگ ہو رہی ہے/ہمیں آخری راستے میں دھکیل رہی ہے/ اس گزرگاہ میں ہمارے ہاتھ پاؤں چھل رہے ہیں/ زمین ہمیں کچل رہی ہے۔۔۔۔/ہم کہاں جائیں آخری سرحدوں کے بعد /پرندے کہاں اڑیں آخری آسمان کے بعد/پودے کہاں سوئیں ہوا کے آخری سانس کے بعد/ہم اپنے نام سرخ ندی سے لکھیں گے/اُس گیت کے ہاتھ کاٹ دیں گے/ جو ہماری لاشوں پر ختم ہوگا /ہم یہاں مریں گے/ یہاں آخری راستے میں / یہاں اور یہاں/ہمارے خون سے زیتون کا درخت اگے گا۔(۲۳)

اسرائیلی چیرہ دستیاں اور مظالم صرف فلسطین تک ہی محدود نہ رہے۔ بے خانماں اور بے آسرا مہاجرین نے جب لبنان میں پناہ لی تو 1982 میں اسرائیل نے بیروت پر حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ فلسطینی مجاہدوں اور بے بس مہاجرین کا ہفتوں قتلِ عام جاری رہا۔ صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں میں انسانیت سوز بہیمانہ نسل کشی سے نازی بھی شرما گئے۔ درویش کی نظم ''بنام طائرِ سبز رنگ؛ بنام بیداری فلسطین'' اسی پس منظر میں ہے:

تو طائرِ سبز رنگ ہے' اے طائرِ بہاریں/ بے رنگی میں بھی تو چہکتا ہے/ نا امیدی اور مایوسی کی ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی تک تو ایشیاء کی امیدوں کی مانند اکیلا اجنبی سا پھدکتا پھرتا ہے/ تو بہاراں بہار ہے سبز رنگ/ اس وقت سے جب پہلی ماں نے تجھے اس نام سے پکارا/ اس وقت تک کہ نئے نئے ہتھیار جنم لے رہے ہیں/میرے گلے میں دس ہزار مقتول بیٹھے ہیں/ جو ایک بوند پانی کو ترستے رہے/عوام تو طائر ہیں/ اور یہ حکومتیں ہیں جنہیں میں قاتلوں کا گروہ کہتا ہوں /چند دنوں کی بات ہے کہ خون ہر طرف موجزن ہو/ اے میرے طائرِ سبز رنگ میرے اس جسم کو/خنجروں اور چاقوؤں نے یوں ٹکڑے کر دیا ہے/جس طرح ہجے کرتے وقت کوئی بچہ لفظوں کو بکھیر دے۔(۲۴)

درویش نے 1982 میں اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

"I may be a poet, but the tragedy and the amount of Palestinian blood which has been shed is greater by far the any poem can express or even comprehend".(۲۵)

فلسطین کی معروف اور معتبر شاعر فدوٰی طوقان کہتی ہیں کہ محمود درویش کی نظموں میں زندگی کے تجربوں میں پھوٹنے والا انسانیت کا گہرا شعور ملتا ہے۔(۲۶) جبر اور ظلم کی سیاہ رات میں جینا اور پھر اپنے آپ کو قومی و نسلی تعصبات سے بالاتر رکھتے ہوئے انسانیت اور احترام آدمیت کے دیپ ہتھیلیوں پر جلائے رکھنا ایک مشکل کام ہے جو محمود درویش نے سر انجام دیا ہے۔ اسے اپنی انسانیت پر فخر ہے۔ وہ انسانیت اور سیاست کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسان اس کیلئے ایک خزانہ ہے اور بقول درویش وہ پہلا عرب شاعر ہے جو ایک اسرائیلی سپاہی کو، جون کی جنگ کے بعد بھی، اپنے انسانی رشتے کے واسطے سے ملا تھا۔ درویش کی نظم ''ایک سپاہی، جو سفید پھولوں کے خواب دیکھتا ہے'' اسی ملاقات کے پس منظر میں لکھی گئی۔ یہ نظم ایک اسرائیلی سپاہی کے ساتھ درویش کی گفتگو ہے جو جنگ سے اس لیے نامراد اور آزردہ خاطر لوٹا تھا کہ اس میں اس کا انسانی رشتہ اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔(۲۷)

سیف دین عماوس نے محمود درویش کو پیامبرِ انسانیت قرار دیتے ہوئے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"For me, the most striking and admirable aspect of Darwish's poetry is how it remained so resolutely humanist and universalist in the message. Never did Darwish succumb to cheap nationalism and chauvinism; never did he resort to vilification of his oppressors or the usual jingoism so common in poliitcal art and literature. Never did he forget that his oppressor too is human, just like him. The magnanimity, forgiveness and humanism he exhibited in his work remain the ultimate credit to this great author.

Throughout ethnic cleansing, living as a second class citizen, being placed under house arrest, having his second class citizenship revoked, being chased and hounded from one exile to another, being bombed in almost each of these exiles and living under countless seiges, Darwish's humanism never succumbed".(۲۸)

اس بات کی تائید کیلئے محمود درویش کی نظم "A State of Seige" کی ابتدائی سطریں کافی ہیں۔ یہ نظم 2002 میں اس وقت لکھی گئی جب رملہ کا محاصرہ کیا گیا۔ اسرائیلی شیلنگ کر رہے ہیں اور محمود درویش محاصرہ کرنے والے اسرائیلی سپاہی سے مخاطب ہے:

You, standing at the door steps, come in/ And drink with us our Arabic coffee/ For you may feel that you are human like us. (۲۹)

محمود درویش رجائیت کا بھی پیامبر ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ فلسطین کے زخموں کو گنتے گنتے بے حد اداس اور پریشان ہو جاتا ہے۔ گلیلی میں مرتے ہوئے پرندے اس کو بے چین اور مضطرب کر دیتے ہیں لیکن وہ اپنے محبوب وطن کیلئے ہر طرح کی اذیت اور مشقت برداشت کرنے کیلئے تیار ہے۔ درویش کے نزدیک اس کا وطن وہ رسی ہے جس پر ہر روز خونی کپڑے لٹکائے جاتے ہیں لیکن اس کے خیال میں یہ رسی اس کے دشمنوں کے گلے کا پھندا ضرور بنے گی۔ اس کی زمین بنجر نہیں ہے اور شہیدوں کے خون کی سیرابی ضرور رنگ لائے گی۔ درویش کے مسلک میں لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔ اسی تاریکی سے اجالے جنم لیں گے انہی طوفانوں میں آزادی کے گوہر تابدار پرورش پا کر نمودار ہونگے۔ دکھوں اور مصیبتوں کے خار زاروں میں پھول ضرور بہار دکھلائیں گے:

مگر میں/تمہیں یقین دلاتا ہوں/ کہ میں موت نہیں قبول کروں گا / میں ان خون آشام نغموں کے آنسوؤں کو/ جلا دوں گا/ میں زیتون کے درختوں کی/تمام نامہرباں شاخوں کو کاٹ دوں گا / اگر میری خوف سے بھری ہوئی آنکھوں کے پیچھے/ خوشی کے گیت ہیں/ تو یہ صرف اس لیے/کہ

طوفانوں نے مجھ سے/ نئی شرابوں کی قوس قزح کا وعدہ کیا ہے/ طوفانوں نے/ اطاعت کرنے والے بزدل پرندوں کو خاموش کر دیا ہے/ اور راستے میں کھڑے ہوئے درختوں سے/ ان کی بے مصرف اور بے سایہ شاخیں چھین لی ہیں/ مگر/ اے زخم خوردہ شہر/ میں تجھ پہ ناز کرتا ہوں/ کہ تو ہماری اداس راتوں میں روشنی ہے/ جب راستے گھورتے ہیں/ تب تو اپنے سائے میں مجھے/ افترتوں سے پناہ دیتا ہے/ میں انہیں خوف بھری آنکھوں کے پیچھے/ خوشی کے گیت اس وقت تک گاتا رہوں گا/ جب تک/ یہ طوفان میری دھرتی کو نہ گھیر لے/ ہاں طوفانوں نے مجھ سے نئی شرابوں کی قوس قزح/ کا وعدہ کیا ہے۔(۳۰)

یہ حقیقت ہے کہ جذباتی اور سیاسی طور پر درویش کی سب سے مضبوط اور مستحکم وابستگی ارضِ فلسطین کے ساتھ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دنیا کے باقی مظلوم اور مقہور عوام کیلئے سرد مہری کا رویہ رکھتا ہے ۔ وہ دنیا کے تمام حریت پسندوں اور حق وصداقت کے علمبرداروں کا ہم نوا ہے۔ درویش کا دل آزادی کے متوالوں کے ساتھ دھڑکتا ہے چاہے وہ الجزائر میں ہوں یا افریقہ میں، ویت نام میں ہوں یا کیوبا میں ۔ درویش کے نغمے استعماری اور استحصالی قوتوں کی زیادتیوں کے خلاف نبرد آزما تمام مظلوم و بے بس اقوام کیلئے ہیں۔ یہی چیز درویش کو عالمی انسانی برادری کا ایک ہمدرد فرد بناتی ہے اور اُس کی شاعری کو آفاقی قدر سے منور کرتی ہے:

مت کہو مجھ سے/ کہ ہوتا الجزائر میں اگر میں اور ہوتی نان کی میری دُکان/ پھر میں گاتا باغیوں کے ساتھ گیت/ مت کہو مجھ سے/ کہ ہوتا گر یمن میں گلہ بان/ پھر میں گاتا وقت کی لرزہ بر اندازی کے گیت/ مت کہو مجھ سے/ کہ ہوتا میں ہوانا کے کسی کیفے میں اک ویٹر اگر/ پھر میں گاتا غم کی ماری عورتوں کے واسطے نصرت کے گیت/ مت کہو مجھ سے/ کہ ہوتا گر جواں مزدور میں ۔۔۔ اسوان میں/ پھر چٹانوں کیلئے گاتا میں گیت/ میرے ہمدم/ والگا میں نیل کا پانی تو بہہ سکتا نہیں/ کانگو دریا ہو یا ہو جارڈن/ ہو سکتے نہیں وہ دریائے فرات/ ہے ہر اک دریا کا اک منبع الگ/ راستہ اس کا الگ ہے، زندگی اس کی الگ/ میرے ہمدم/ سرزمین اپنی بھی بنجر تو نہیں/ وقت ہوتا ہے معین/ ہر زمین کی آفرینش کیلئے/ ہے سویرے سے ملن اک دن ضرور/ ہر مجاہد کے لئے (۳۱)

جہاں تک محمود درویش کے ادبی افکار ونظریات کا تعلق ہے درویش نے کورگی اور لینن کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے فکری نظریات کی روشنی میں اپنا ابتدائی ادبی سفر شروع کیا۔ پھر اس تحریک میں شامل ہو گئے جس کے روحِ رواں مصر کے ممتاز ادیب ومفکر سلامہ موسیٰ (م 1958) تھے جن کے ادبی تصورات کی تشہیر میں عمر فاخوری، رئیف الخوری، محمود امین العالم، عبدالعظیم انیس، حسین مروہ، عبدالوہاب البیاتی اور بدر شاکر السیاب جیسے ادیبوں اور نقادوں نے حصہ لیا۔ ان لوگوں نے زندگی کے سلگتے ہوئے مسائل اور موضوعات کو ادب کا حصہ بنایا۔ سماج مخالف اور فراریت پسند ادب کو ترک کر کے صحت مند ادبی نظریات کا ساتھ دیا۔ اشتراکیت کے انسانی اقدار پر مبنی تصورات اور لورکا، ناظم حکمت، مایا کوفسکی ، پابلو نرودا، اور لوئی اراگان کے انقلابی خیالات سے متاثر ہو کر 1961 میں کمیونسٹ پارٹی کی باضابطہ رکنیت بھی حاصل کی ان کی رجائیت پسندی اور انسانی دوستی کے پس منظر میں یہ عناصر بھی کارفرما ہیں۔ (۳۲)

درویش کی شاعری اس امر کی غماز ہے کہ وہ ادب سے محض تسکینِ ذوق اور تکمیل شوق کے بجائے خودگری اور آدم گری کے منصب کا متقاضی ہے۔ وہ ادب جو انسانیت کے مسائل کا ترجمان اور اعلیٰ قدروں کا نگہبان نہیں ہے، بے رنگ، بے سود اور بے مصرف ہے۔ اس کے برعکس اگر شاعر و ادیب کے فیض سے مزرعِ زندگی میں بہار آتی ہے تو اس کے وجود کا جواز یقیناً موجود ہے۔

ہماری نظمیں بے رنگ ہیں/ بے ذائقہ۔۔۔ بے آواز/ اگر وہ ایک گھر سے دوسرے گھر تک/ روشنی لے کے نہیں جاتیں/ اور اگر خلقِ خدا ان کے معانی نہیں سمجھتی/ تو بہتر ہے کہ ہم انہیں ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں بکھیر دیں/ اور اپنے تئیں خاموشی کے حوالے کر دیں۔

کاش یہ اشعار/ ایک محنت کش کے ہاتھ کی چھینی ہوتے / یا ایک مجاہد کے ہاتھ میں بارودی گولہ/ کاش یہ اشعار۔

کاش یہ الفاظ/ ایک کسان کے آگے چلنے والا ہل ہوتے / اور تن کا کپڑا، یا گھر کی چوکھٹ، یا صندوق کی چابی/کاش یہ الفاظ (۳۳)

شخصیت اور افکار ونظریات میں مطابقت اور ہم آہنگی عطیہ خداوندی ہے۔قول وفعل کی مطابقت انسان کی عظمت اور سچائی کی بین دلیل ہے ۔ درویش بھی اسم بامسمیٰ ہے اگر اسرائیلی حکومت ہر طرح کے جبر، دباؤ اور لالچ کے ہتھکنڈوں سے درویش کو زیر کرنے میں ناکام رہی ہے تو یاسر عرفات بھی درویش کو اپنے اصولی موقف سے دستبردار نہ کر سکے۔ اس ضمن میں منو بھائی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے:

اوسلو معاہدے کے بعد جب 1993 میں یاسر عرفات مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کو فلسطین اور اپنی مملکت سمجھ لینے پر تیار ہو گئے تو انہوں نے اصرار کیا کہ محمود درویش ان کی فلسطینی کابینہ میں شامل ہو جائیں۔ مگر محمود درویش نے صاف انکار کر دیا۔ تو یاسر عرفات نے اپنی طرف سے یہ زبردست دلیل پیش کی اگر آندرے ماریو فرانس کے صدر چارلیس ڈیگال کی کابینہ میں بطور وزیر بیٹھ سکتے ہیں تو محمود درویش کو کیوں انکار ہے؟ محمود درویش نے اس انکار کی تین وجوہات پیش کیں:

پہلی یہ کہ مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی فرانس نہیں ہے دوسری یہ کہ یاسر عرفات چارلس ڈیگال نہیں ہیں اور تیسری یہ کہ محمود درویش آندرے ماریو نہیں ہے

اور پھر یہ بھی کہا ''آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ اگر غزہ کی پٹی اور مغربی کنارہ فرانس جیسی عظیم مملکت بن چکی ہے اور یاسر عرفات چارلس ڈیگال کے برابر پہنچ گئے ہیں اور محمود درویش آندرے ماریو کے مقابل آ گیا ہے تو پھر میں آندرے ماریو کے بجائے ژاں پال سارتر بننے کو ترجیح دوں گا''۔(۳۴) یاسر عرفات نے نہ صرف وزارت کی پیش کش قبول نہ کی بلکہ PLO کی رکنیت سے بھی مستعفی ہو گئے اور وقت نے ثابت کیا کہ ان کی عظمت اور شہرت ان مناصب کی رہین منت نہیں۔

محمود درویش کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے مختلف سوالات اور اعتراضات وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں جن میں بعض کا جواب خود درویش نے اور بعض کا وقت نے دیا ہے۔ مثلاً جب درویش نے 1971 میں مقبوضہ فلسطین سے باہر رہ کر کام کرنے کا اعلان کیا تو متعدد عربی

اخبارات نے ان کو ہدف ملامت بنایا اور اسے محاذِ جنگ سے پسپائی اور فرار کا نام دیا لیکن درویش نے جواب دیا کہ میں تو وطن سے قریب تر ہونے کیلئے اپنا وطن چھوڑ رہا ہوں۔(۳۵) اور وقت نے ثابت کیا کہ اُس نے فلسطین سے باہر رہ کر فلسطینیوں کی زیادہ خدمت کی اور دنیا کے سامنے فلسطینی مقدمے کو زیادہ موثر انداز میں پیش کیا۔

محمود درویش کی شاعری کے مزاحمتی رنگ اور ان کے علامتی انداز کے بارے میں درووِیش نے اپنی ایک گفتگو میں مفصل بحث کی اور محمد کاظم نے اسے اردو کا رنگ روپ دیا ہے۔ درویش کی شاعری کے مزاحمتی رنگ کے بارے میں ان کا موقف ہے۔

''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں جس طرح کی شاعری کرتا ہوں اسے مزاحمت کی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ وہ صرف اختلاف اعتراض کی شاعری ہے۔۔۔لوگ کچھ بھی کہیں میرے لیے شاعر ہونے کے ناتے جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ میں اپنا کام کرتا جاؤں بغیر یہ سوچے سمجھے کہ میں کس طرح کا شاعر ہوں اور شاعری میں میرا مرتبہ کیا ہے۔مزاحمت کی شاعری، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ، وطن کی مدافعت کے مقصد کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ ایسی قوتوں کے خلاف مدافعت جو وطن کو اپنے جبر و تسلط میں لانا چاہتی ہیں۔ چنانچہ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں، اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس سے ایک ایسا انسان ابھر کر سامنے آئے گا جو مختلف صورتوں اور مختلف لبادوں میں وطن کا دفاع ہی کر رہا ہوتا ہے اور میں ہر اس طاقت کا مدِ مقابل ٹھہرتا ہوں جو مجھ سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے ۔ زمین میرے لیے محض زمین نہیں ہے، درخت محض درخت نہیں ہیں اور شام کوئی سی شام نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں فطرت کا شاعر نہیں ہوں میں ایک سرزمین کا شاعر ہوں۔ وطن کا شاعر ہوں، اور میرا اعتراض و احتجاج جز کی طرف سے کل کے خلاف نہیں ہے بلکہ ایک قابض و معاند کے خلاف ہے۔ میں اپنے جیلر سے بات کر لیتا ہوں تو صرف اس لیے کہ میں بولنا چاہتا ہوں اور مسلسل تنہائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے اور اگر میں اپنے جیلر کی بیوی سے نفرت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ گھل مل گیا ہوں''۔(۳۶)

اصل میں بعض حلقوں کی جانب سے درویش سے جس جذباتی شاعری اورفعرہ بازی کی توقع کی جا رہی تھی وہ اس کے حق میں نہیں تھا۔ یہ طے ہے کہ سوچ اور فکر کے بغیر محض ہنگامی شاعری کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ درویش کے ہاں جذبات ضرور ہیں لیکن جذباتیت نہیں۔ اس لیے اپنی اعلیٰ فنی معیارات کی شاعری کے باعث وہ آج مزاحمتی شعراء کا سرخیل شمار ہوتا ہے۔

رمزیت اور علامتیت جہاں ایک طرف شاعری کے حسن کو دو چند کرتی اور اس کو وسعت اور گہرائی عطا کرتی ہے وہیں بعض اوقات عام قاری کیلئے ابہام اور پیچیدگی کا باعث بھی بنتی ہے۔ درویش کے ہاں بھی علائم و رموز بکثرت موجود ہیں۔محمود درویش کے ہاں علامتی و استعاراتی رنگ کس قدر گہرے رہے ہیں ان کا اندازہ اس کی چند کتابوں کے ناموں سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً تتلی کا بوجھ، گلیلی میں پرندے مرتے ہیں، زیتون کی پتیاں، گیارہ سیارے، پروں کے بغیر پرندے وغیرہ ۔اس طرح صلیب، بادل، نغمہ، چٹان، خواب، قفس، عقاب، بارش، جنگل، خزاں، سمندر وغیرہ متعدد علامتیں درویش کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ درویش اپنے علامتی رنگ کی وضاحت میں کہتا ہے:

''علامت میری واقعیت کے بھرپور اظہار کے کام آتی ہے اور اسے زیادہ پر مایہ بنا دیتی ہے اور جس طرح ایک انقلابی شاعر اپنے انقلابی شعور اور رومانی گیت نگاری کے درمیان ایک رشتہ استوار کر لیتا ہے ۔اسی طرح وہ اپنے اس شعور کے لئے علامت سے بھی کام لے سکتا ہے اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کا انقلابی جوہر اس کی وجہ سے دب کر نہ رہ جائے۔ شاعری میں علامت، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کچھ اور پہلوؤں کا اضافہ کر دیتی ہے اور اس کے پر وبال میں بڑی قوت پیدا کرتی ہے اور شاید علامت جدید عربی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے جو اسے ایک اعلیٰ فنکارانہ قدر و قیمت عطا کرتی ہے پھر یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ زیادہ تر اساطیر ہی نئی نظم میں علامت کا کام دیتے ہیں''۔(۴۷)

درحقیقت محمود درویش کا تعلق اس علاقے سے ہے جو اب اسرائیل کے قبضے میں ہے

مسلسل مشقت، اذیت اور پابندی کی وہ صورتِ حال جس میں کھل کر اظہار کرنے کی آزادی نہ ہو اورسر پر ہر وقت احتساب اورسنسر کی تلوار لٹک رہی ہو شاعر کیلئے علامتی اورمبہم انداز بیان اختیار کرنا صرف اس کے فنی مزاج کا تقاضا ہی نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بن جاتا ہے۔ یہ بات ہمیں محمود درویش کی شاعری میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے اور یقیناً درویش نے علامتوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو وسعت اور گہرائی بھی عطا کی ہے۔(۳۸)

بقول جوڈتھ گیبرئیل:

محمود درویش ساٹھ کی دہائی میں ادب مزاحمت کا اہم ترین نام بن کرابھرا فلسطینی تجربے پر اپنی شاعری کیلئے اسے بین الاقوامی داد وتحسین حاصل ہوئی جس میں اس نے نظریات کے بجائے انسانی لمحے کی تصویر کشی کی ہے اور اپنی قوم کے وقار سے مستقل سرشار ہوکرسرگرداں رہا ہے۔(۳۹)

بلاشبہ محمود درویش وہ خوش قسمت شاعر ہے جسے اپنے حینِ حیات ہی میں دنیا بھر میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کی تخلیقات دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ اردو میں انہیں پرستاروں کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا۔فیض احمد فیض سے ان کی راہ ورسم رہی اور اعجاز احمد،ضمیر احمد، کشورناہید، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر انور زیدی، انور سین رائے،منو بھائی، ذیشان ساحل اور آصف فرخی وغیرہ جیسے نامور لوگوں نے انہیں اردو دنیا میں متعارف کرایا۔ ذیشان ساحل نے درویش سے دل بستگی کے اظہار کے لئے ''محمود درویش کے لئے خط'' کے عنوان سے ایک عمدہ نظم بھی لکھی۔ آصف فرخی نے اس نظم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

محمود درویش وفا داری بشرطِ استواری کا نام ہے۔فلسطین کی کہانی درویش کے لہو میں شامل ہے اور اس نے آخری دم تک اس لہو رنگ داستان کو خون جگر سے رقم کیا ہے ۔اس نے وقت کی ہر مصلحت جبر کے ہر حربے اور لالچ کے ہر زاویے کونظر انداز کرتے ہوئے لفظ کی حرمت کی پاسداری کی ہے اپنے ضمیر کو ہمیشہ زندہ رکھا ہے اور اپنی نظم وفا میں اس کی تجدید کی ہے:

لفظ کی حرمت پر میرا ایمان ہے/ چاہے اس کی خاطر میں مر کر خاک ہوجاؤں یا زندہ رہوں اور دشمن

کی گھات میں بیٹھوں/لفظ کی ناریت پر میرا ایمان ہے/ چاہے اس آگ میں خود میں جل کر راکھ ہو جاؤں ۔۔۔یا میرا دشمن اس میں بھسم ہو/اگر میں علَم ہاتھ میں تھامے کھیت بھی رہوں گا/تو لوگ میرے کتبے پر تحریر کریں گے"وہ شخص جو مرا نہیں تھا"(۴۰)

سرسبز اور اونچی سرزمین کی نظموں والے شاعر محمود درویش نے کہا تھا کہ اس نے موت کو شکست دے دی ہے وہ جینا چاہتا ہے ۔درویش مرنا نہیں چاہتا تھا سو اس نے ایسا ہی کیا اب اس کی شاعری نے بھی مرنے سے انکار کر دیا ہے۔ دونوں امر ہو چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

(۱) بحوالہ منو بھائی، ''ایسے نہ کہو میرے دوست''، لاہور: روزنامہ جنگ، 24 اگست 2008، ص 3

(۲) ضمیر احمد۔ دوسروں کی شاعری۔ کراچی: شہر زاد، 2001ء، ص178

(۳) یہ معلومات ضمیر احمد کی مرتبہ دوسروں کی شاعری، منو بھائی کی مرتبہ فلسطین فلسطین، عبدالحق حقانی قاسمی کی فلسطین کے چار ممتاز شعراء، روزنامہ نوائے وقت 15 اگست 2008 اور ڈان میگزین مورخہ 24 اگست 2008 سے لی گئی ہیں۔

(۴) Siafedean Ammous. "Mahmoud Darwish: Palestine's Prophet of Humanism", http://electronicintifada.net/v2/article9758.shtml Page1of5

(۵) Sinan Anton. "Farewell Mahmoud Darwish", http://weekly.ahram.org.eg/print/2008/910/fr1html

(۶) محمود درویش ۔مشمولہ فلسطین کے چار ممتاز شعراء۔ مرتب :عبدالحق حقانی قاسمی، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 1995، ص 103

(۷) http://www.suite101.com/article.cfm/arab culture and identity/2 8915/2

(۸) ایڈورڈ سعید''فلسطینی شعور کا ظہور''، مترجم: شاہد حمید مشمولہ دنیا زاد (عاشق من الفلسطین 2)

مرتب؛ آصف فرخی، کراچی: شہرزاد، 2001، ص 16

(۹) محمود درویش۔ شناختی کارڈ، مشمولہ دوسروں کی شاعری۔ مرتب؛ ضمیر احمد، کراچی: شہرزاد، 2001، ص 182

(۱۰) محمود درویش، ایک فلسطینی شاعر کا سفر زندگی، مشمولہ عربی ادب میں مطالعے، مترجم: محمد کاظم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1990، ص 187

(۱۱) محمود درویش، ''انقلابی اور شاعر''، مشمولہ فلسطین فلسطین، مترجم، منو بھائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1994، ص 76

(۱۲) Saifdean Ammous. Mahmoud Darwish: Palestine's Prophet of Humanism, http: electronic intifada.net/v2article9758.shtml page 2 of 5

(۱۳) محمود درویش۔ ''ایک فلسطینی شاعر کا سفر زندگی۔ محمود درویش''، مشمولہ عربی ادب میں مطالعے، مترجم: محمد کاظم، ص 183

(۱۴) محمود درویش۔ ''ایک فلسطینی شاعر کا سفر زندگی۔ محمود درویش''، مشمولہ عربی ادب میں مطالعے، ص 186

(۱۵) ایڈورڈ سعید۔ میں اور میرا فلسطین۔ مترجم: محمد یحیٰی خان، لاہور: نگارشات، 2003، ص 141

(۱۶) محمود درویش۔ ''لمبے سائے کی مدح میں''، مشمولہ دنیا زاد (عاشق من الفلسطین 2)، مرتب: آصف فرخی، کراچی: شہرزاد، 2001، ص 250

(۱۷) Sinan Antoon, "Farewell Mahmoud Darwish", http://weekly.ahram.orge.g/print/2008/910fr1.html page 1 of 3

(۱۸) محمود درویش ''ماں کے نام (جلاوطن کا خط)''، مشمولہ فلسطین فلسطین۔ مرتب: منو بھائی، ص 47

(۱۹) محمود درویش۔ ''شناختی کارڈ''، مشمولہ دوسروں کی شاعری، ص 182

(۲۰) محمود درویش۔ ''آدمی کے لئے''، مشمولہ دنیا زاد (عاشق من الفلسطین 2)، مرتب: آصف فرخی، ص 255

(۲۱) محمود درویش۔ ''ردِعمل''، مشمولہ فلسطین فلسطین، ص 67

(۲۲) محمود درویش ۔ ''غصہ''، مشمولہ فلسطین فلسطین، ص70

(۲۳) محمود درویش ۔ ''زمین ہم پر تنگ ہو رہی ہے''، مشمولہ فلسطین فلسطین، ص159

(۲۴) محمو د درویش ۔ ''بنام طائر سبز رنگ : بنام بیداری فلسطین''، مترجم :سجاد رضوی، مشمولہ سویرا نمبر 4-54، لاہور: نیا ادارہ، مارچ 1977، ص58-255

(۲۵) Mahmoud Darwish. "The lost memory" (Interview) included in Al-Hawadess Translator; Barbara Harlow, Beirut: Institute for Arab Research, 1982. P 82.

(۲۶) فدوی طوقان ۔ ''ایک عرب شاعرہ کی ڈائری سے''، مشمولہ عربی ادب میں مطالعے، مترجم :محمد کاظم، ص160

(۲۷) محمود درویش ۔ ''ایک فلسطینی شاعر کا سفر زندگی''، مشمولہ عربی ادب میں مطالعے، ص 193

(۲۸) Saifdean Ammous. "Mahmoud Darwish Palestin'e Prophet of Humanism, http:/electronicintifada.net/v2/article9758.shtml. Page 2 of 5

(۲۹) Mahmoud Darwish. "A state of seige" electronic intifada, page 2 of 5

(۳۰) محمود درویش ۔ ''طوفان کا وعدہ''، مشمولہ فلسطین کے چار ممتاز شعراء، مرتب :عبدالحق حقانی قاسمی، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 1995، ص106

(۳۱) محمود درویش ۔ '' خواہش'' مترجم :ضمیر احمد ، مشمولہ دوسروں کی شاعری، کراچی: شہرزاد، 2001، ص184

(۳۲) عبدالحق حقانی قاسمی ۔ فلسطین کے چار ممتاز شعراء دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 1995، ص100

(۳۳) محمود درویش ۔ ''شاعری کے بارے میں''، مشمولہ اخوان الصفا اور دوسرے مضامین، مترجم :محمد کاظم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2003، ص271

(۳۴) منو بھائی ۔ ''ایسے نہ کہو میرے دوست''، مشمولہ، روزنامہ جنگ، لاہور: 24 اگست 2008، ص3

(۳۵) منو بھائی ۔ فلسطین فلسطین ۔ ص15

(۳۶) محمود درویش ۔ ''محمود درویش کی ایک گفتگو اور ایک طویل نظم''، مشمولہ اخوان الصفا اور دوسرے مضامین، مترجم: محمد کاظم، ص 254

(۳۷) محمود درویش ۔ ''محمود درویش کی ایک گفتگو اور ایک طویل نظم''، مشمولہ اخوان الصفا اور دوسرے مضامین، ص 256

(۳۸) محمد کاظم ۔ ''مقدمہ''، مشمولہ عکس، مترجم: امجد اسلام امجد، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1976، ص 25

(۳۹) جوڈتھ گیبرئیل ۔ ''فلسطینی شاعری کی نصف صدی''، مشمولہ دنیا زاد (عاشق من الفلسطین 2) مترجم: آصف فرخی، ص 89

(۴۰) محمود درویش ۔ ''وفا''، مشمولہ عربی ادب کی تاریخ، مترجم: محمد کاظم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2004، ص 483